© rasailojaraid.com

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی قسط (۲) آخری

عجمی تصوّرات کا دوسرا دور

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل سوال اُبھرتے ہیں:

(۱) کیا اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے یا نہیں؟

(۲) اگر وہ مسبب الاسباب ہے تو دُعا رکی بنار پر مطلب کے حصول کے لیے کوئی سبب بنا سکتا ہے یا نہیں؟

گویا یہ بالواسطہ خدا کی قدرت سے انکار ہے، جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ خدا کی حقیقت بہ محض ایک تماشائی کی سی ہے۔

اگر دعار کی استجابت سے یہی مراد ہے کہ "اس سے دل کو اطمینان نصیب ہو جائے جو حصول مطلب میں ممکن تھا" اور یہ استجابت صرف قلبی واردات سے ہی تعلق رکھتی ہے اور خارج میں کچھ نہیں ہوتا تو مندرجہ ذیل آیت کا کیا مطلب ہوگا:

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ (القمر: ۱۰ تا ۱۲)

نوح نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ میں (کفار کے مقابلے میں) کمزور ہوں تو اُن سے بدلہ لے۔ پس ہم نے زور کے مینہ سے آسمان کے دھانے کھول دیئے اور زمین میں چشمے جاری کر دیئے تو پانی ایک کام کیلئے جو مقدر ہو چکا تھا، جمع ہوگیا۔

اب دیکھئے کہ کیا دُعا کے بعد آسمان سے بے تحاشا پانی برسنا اور زمین کے چشمے مل کر طوفان کی شکل بننا اور اس طرح کرب عظیم سے نوحؑ اور اُن کے تمام ساتھیوں کو نجات دینا۔ کیا یہ سب قلبی واردات ہیں جو دُعا کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئیں، یا واقعاتی معاملات سے تعلق رکھتی ہیں؟

پھر ایک مقام پر سرسید صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ:

"بسا اوقات دعار کی جاتی ہے مگر حاجت برآری نہیں ہوتی۔ پس معلوم ہوا کہ دُعا کوئی سبب حصولِ مقصد کے لیے نہیں ہے ورنہ ایسا نہ ہوتا۔"

(تہذیب الاخلاق ۱۰ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس اقتباس میں "بسا اوقات" کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ دعا رکبھی کبھار حصولِ مقصد کا سبب بن بھی جاتی ہے۔ بس یہی ہمارا مقصد ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ بسا اوقات قبول نہیں ہوتی۔ تو دعا کی قبولیت کے کئی موانع ہیں۔ جن کی تفصیل یہاں خارج از بحث ہے۔ نیز ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دعا کی طرح دوا بھی بسا اوقات مرض کا علاج بن نہیں سکتی۔ لیکن کبھی کبھار حصولِ مقصد کا سبب بن بھی جاتی ہے۔

۲۔ بنی اسرائیل کا بندر بننا:

"اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے عجیب باتیں بیان کی ہیں۔ کسی نے کہا وہ سچ مچ بندر بن گئے اور وہ سب تیسرے دن مر گئے۔ کسی نے کہا کہ یہ بندر جو اب درختوں پر اُچھلتے پھرتے ہیں انہی کی نسل سے ہیں مگر یہ سب باتیں لغو و خرافات ہیں۔ یہودیوں کی شریعت میں سبت کا دن عبادت کا دن تھا۔ اور اس میں کوئی کام کرنا یا شکار کھیلنا منع تھا مگر ایک گروہ یہودیوں کا جو دریا کے کنارے پر رہتا تھا، فریب سے سبت کے دن بھی شکار کھیلتا تھا۔ ان کی قوم کے مشائخوں نے منع کیا۔ اور ان کو قوم سے منقطع، برادری سے خارج، کھانے پینے سے الگ میل جول سے علیحدہ کر دیا۔ اور وہ توریت پر نہ چلنے والوں کو ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ خدا نے فرمایا ہے کُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ یعنی جس طرح بندر بلا پابندی شریعت حرکتیں کرتے ہیں، جس طرح انسانوں میں بندر ذلیل و خوار ہیں اسی طرح تم بھی انسانوں سے علیحدہ اور ذلیل و خوار و رسوا رہو۔" (تفسیر القرآن ج، ص ۱۰۰)

اس تاویل پر درج ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

(۱) گر تورات پر نہ چلنے والوں سے بنی اسرائیل پہلے سے ہی بائیکاٹ کا رویہ اختیار کیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ کو یہ حکم دینے کی کیا ضرورت پیش آئی؟

(۲) یہ معاشرتی بائیکاٹ تو ان تین صحابہ کا بھی ہوا تھا جو جنگِ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے انھیں تو ایسی سزا نہیں دی گئی۔ نہ ہی اس طرح کے خطاب سے نوازا گیا ہے؟

(۳) اگر محض ذلیل و خوار کرنا ہی مقصود تھا تو کئی قسم کی مخلوق بندر سے بھی زیادہ ذلیل تر ہے۔ مثلاً کتا اور سؤر۔ جب ظاہری طور پر ہونا ہوانا کچھ نہیں تھا تو پھر انھیں بندر ہی کہنے کی کیا تخصیص تھی؟

۳۔ اللہ تعالیٰ کی مارنے اور زندہ کرنے کی قدرت:

قرآن کریم میں ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ — بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو (شمار میں)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ۔
(البقرہ ۲۴۳)

ہزاروں ہی تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے تو خدا نے ان کو حکم دیا کہ مرجاؤ پھر ان کو زندہ بھی کر دیا۔
(فتح الحمید)

اس آیت میں سید صاحب "فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ" کا ترجمہ یوں پیش فرماتے ہیں:
"پھر ان سے کہا اللہ نے مرو تم (یعنی بسبب موت کے ڈر کے یا اپنی نامردی کے اور لڑنے کے ڈر سے) پھر جلایا ان کو (یعنی ان کے دل میں شجاعت اور ارادہ جنگ پیدا کیا)"۔
(تفسیر القرآن ج ۱ ص ۲۱۲)

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی مارنے اور زندہ کرنے کی قدرت سے مراد صرف (ذہنی تبدیلی) تبدیلی ہوتی ہے، امر واقعہ کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ دوسرے بیشمار مقامات پر بھی سید صاحب ایسے خوارق عادت واقعات کو ذہنی تبدیلی کے حوالے کر دینے کے عادی ہیں۔

۴۔ حضرت عزیر کی موت اور زندگی:

سورۂ بقرہ میں (غالباً) حضرت عزیرؑ کو مارنے اور پھر زندہ کرنے کا ذکر آیا ہے۔ اس آیت کو ہم سید صاحب کے ترجمہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ
(البقرہ: ۲۶۰)

"یا (تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا یعنی اس کا حال نہیں جانا جس نے رؤیا میں دیکھا، کہ گویا وہ گزرا ایک شہر پر ایسی حالت میں کہ وہ سر بل گرا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ کیونکر زندہ کرے گا (یعنی آباد کرے گا) اللہ اس کو اس کے مرجانے کے (یعنی ویران ہونے کے) بعد۔ پھر اللہ نے اس کو سو برس تک مرا ہوا رکھا پھر اس کو اٹھایا۔ خدا نے کہا کہ کتنی دیر تو پڑا رہا۔ اس نے کہا کہ میں پڑا رہا ایک دن یا کچھ کم ایک دن کہا بلکہ تو پڑا رہا سو برس۔ پھر دیکھ اپنے کھانے کو اور اپنے پینے کو (کیا)، وہ نہیں بگڑا ہے
(تفسیر القرآن ج ۱ ص ۲۲۴)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دیکھ اپنے گدھے کو (کیا وہ نہیں گل گیا ہے) اور میں چاہتا ہوں کہ تجھ کو ایک نشانی آدمیوں کے لیے بناؤں اور دیکھ ہڈیوں کو کس طرح ہم ان کو حرکت میں لاتے ہیں پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں۔ پھر جب اس کو (یہ بات) ظاہر ہوئی۔ اس نے کہا (حالت بیداری میں) میں جانتا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے"

اس ترجمہ پر درج ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

(۱) سید صاحب کی یہ عادت ہے کہ جس خرق عادت واقعہ میں تاویل کی کوئی گنجائش نظر نہ آئے۔ وہ اسے خواب کے سپرد کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی انھوں نے ابتدا ہی میں بریکٹوں میں (رؤیا میں دیکھا) لکھ اس سہل ترین طریقہ سے مطلب برآری کی ہے جس کے لیے قرآن کے الفاظ میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۲) اس واقعہ میں اللہ نے دو طرح کے نشانات بتلائے ہیں۔ ایک کھانے پینے کی چیزیں جن پر مرور زمانہ کا کوئی اثر نہیں اور وہ بالکل تر و تازہ ہیں۔ دوسرے گدھا جس پر سو سال کی مدت گزرنے کی وجہ سے اس کی ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ اگر یہ واقعہ خواب کا تصور کیا جائے تو گدھے کو اس حالت میں ہونا چاہیے تھا۔ قضاء و نتائج کی کیا تک تھی؟

(۳) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ولنجعلك اٰیۃ للناس تو کیا کسی کے خواب کے واقعات بھی آیۃ للناس ہوا کرتے ہیں؟

(۴) پھر جب آخر میں آپ حضرت عزیرؑ کو جگا کر ان کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ اعلم ان اللہ علی کل شیء قدیر۔ یہ فقرہ بھی وہ خواب ہی میں کہہ دیتے تو کیا فرق پڑتا تھا؟ کیا ان اللہ علی کل شیء قدیر کا دائرہ صرف خواب کے واقعات تک ہی محدود ہے؟ تو یہ قدرت کیا ہوئی یہ تو محض انسانی تخیلات ہوتے ہیں۔

۵۔ پرندوں کی موت اور زندگی:

قرآن کریم کا حضرت ابراہیمؑ سے متعلق درج ذیل واقعہ بھی بمعہ ترجمہ سید صاحب ملاحظہ فرمایئے:

واذ قال ابراھیم رب ارنی کیف تحی	"اور جب کہا ابراہیمؑ نے (خواب میں) اے
الموتی قال اولم تؤمن قال بلی ولکن	پروردگار! مجھ کو دکھا کہ کس طرح تو زندہ کرے گا
لیطمئن قلبی قال فخذ اربعۃ من	مُردوں کو؟ خدا نے کہا کیا تو یقین نہیں کرتا
الطیر فصرھن الیک ثم اجعل علی	ابراہیمؑ نے کہا کیوں نہیں ولیکن میں چاہتا ہوں
کل جبل منھن جزءا ثم ادعھن	کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔ خدا نے کہا کہ لے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یاتینک سعیا واعلم ان اللہ عزیز حکیم ٥ (البقرۃ : ۲۶۰)

(تفسیر القرآن ص ۲۲۴ ج ۱)

چار پرندے، پھر ان کے ٹکڑے کر ڈال۔ پھر رکھ ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ٹکڑا۔ پھر اُن کو بلا۔ تیرے پاس چلے آئیں گے دوڑتے ہوئے۔ اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا۔"

اس آیت میں حسب عادت سید موصوف نے (خواب میں) کا اضافہ کر لیا ہے۔ یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت عزیز حکیم (زبردست حکمت والا) کا اظہار اتنی بات سے ہو جاتا ہے کہ وہ کسی کو ایسا خواب دکھلا دے؟ فافہم وتدبر!

غرض یہ اور ایسے بیشمار واقعات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ سید صاحب نے کس بیچارگی سے افکارِ مغرب کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔

۶۔ جنّت اور دوزخ کی حقیقت :

اخروی زندگی میں نیک اعمال کے بدلہ میں جنت اور بداعمالیوں کے بدلہ میں دوزخ میں داخل کئے جانے کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد سے ہے۔ حضورِ اکرمؐ نے اپنی مکی زندگی کا بیشتر حصہ مسلمانوں میں اسی عقیدہ کو راسخ کرنے میں گزارا اور صدہا آیات قرآنِ کریم میں ایسی موجود ہیں کہ اخروی زندگی میں جنت اور دوزخ کی منظر کشی کرتی ہیں۔ لیکن جنت اور دوزخ بھی چونکہ مابعد الطبیعیات سے تعلق رکھتی ہیں اور عقل اور مشاہدہ کے پیمانوں سے ماپی نہیں جا سکتیں۔ لہٰذا سید صاحب جنت اور دوزخ سے مراد محض روحانی قوت اور کلفت لیتے ہیں، جسے کوئی نہیں سمجھتا۔ جنت اور دوزخ کے متعلق اپنی تفسیر جلد ا ص ۴۳ پر رقمطراز ہیں کہ:

"تمام انسانوں میں خواہ وہ سرد ملک کے رہنے والے ہوں یا گرم ملک کے، مکان کی آراستگی اور خوبی، باغ کی خوشنمائی، بہتے پانی کی دلربائی، میووں کی تر و تازگی سب کے دل پر ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس کے سوا حُسن یعنی خوبصورتی سب سے زیادہ دل پر اثر کرنے والی چیز ہے، خصوصاً جبکہ وہ انسان میں ہو اور اس سے بھی زیادہ جب کہ وہ عورت میں ہو۔ پس بہشت کی (قرۃ اعین) کو ان کی فطری راحتوں کی کیفیات کی تشبیہ میں اور دوزخ کے مصائب کو آگ میں جلنے اور لہو پیپ پلائے جانے اور تھوہر کھلائے جانے کی تمثیل میں بیان کیا ہے تاکہ انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ بڑی سے بڑی لذت و راحت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا سخت سے سخت عذاب وہاں موجود ہے۔ اور درحقیقت جو لذّت وراحت یا رنج وکلفت وہاں ہے۔ ان کو اس سے کچھ بھی مناسبت نہیں ہے۔ یہ تو صرف ایک اعلیٰ راحت واحتظاظ یا رنج وکلفت کا خیال پیدا کرنے کو اس پیرایہ میں جس میں انسان اعلیٰ سے اعلیٰ احتظاظ اور رنج کو خیال کر سکتا تھا، بیان کیا ہے؟

"یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے۔ اس میں سنگِ مرمر اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں، باغ ہیں اور سرسبز درخت ہیں۔ دودھ اور شراب کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے۔ ساقی وساقنیں نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں۔ ایک جنتی، حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے۔ ایک نے ران پر سر دھرا ہے، دوسرا چھاتی سے لپٹا رہا ہے۔ ایک نے لب جاں بخش (بایں ریش وبروت) کا بوسہ لیا ہے۔ کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ۔ بیہودہ ہے، جس پر تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں؟"

اقتباسِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ کا نہ تو کوئی خارجی وجود ہے اور نہ ہی ان کی کچھ حقیقت۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جنت اور دوزخ محض تخیلات کی دنیا کے دو مختلف پہلوؤں کے نام ہیں۔ اگر کوئی شخص خیال جنت میں بستا ہے تو بس یہی اصل جنت ہے جس کا ذکر قرآن میں مختلف پیراؤں میں بیان ہوا ہے۔ پھر آپ محض اس نظریہ پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ جو لوگ آپ کے ہم خیال ہوں انہیں آپ تربیت یافتہ دماغ سمجھتے ہیں۔ اور جو قرآن کے الفاظ ومعانی کو اصل حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں، انہیں کوڑمغز، مُلا کے لقب سے نوازتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"انہی آیات (یعنی جو جنت ودوزخ سے متعلق ہیں) کی نسبت دو مختلف دماغوں کے خیالات پر غور کرو، ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ وعدہ وعید دوزخ وبہشت کے، جن الفاظ سے بیان ہوئے ہیں ان سے بعینہٖ وہی اشیاء مقصود نہیں، بلکہ اس کا بیان کرنا صرف اعلیٰ درجہ کی خوشی وراحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لانا ہے۔ اس خیال سے اس کے دل میں ایک بے انتہا عمدگی جنت کی اور ایک ترغیب اوامر کے بجا لانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک کوڑمغز، مُلا یا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت ان گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پئیں گے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میوے کھائیں گے، دودھ اور شہد کی ندیوں میں نہائیں گے، اور جو دل چاہے گا وہ مزے اڑائیں گے۔ اور اس لغو اور بیہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجا لانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے۔ اور جس نتیجہ پر پہلا پہنچا تھا اس پر یہ بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور کارخانۂ انام کی تربیت کا کام بخوبی تکمیل پاتا ہے۔ پس جس شخص نے ان حقائق قرآن مجید پر جو فطرت انسانی کے مطابق ہیں، غور نہیں کیا۔ اس نے درحقیقت قرآن کو نہیں سمجھا اور وہ اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہا۔" (ایضاً ص ۲۵)

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوا کہ:

(۱) جو لوگ جنت اور اس کی نعمتوں، دوزخ اور اس کے عذاب و رنج کو ایک حقیقت سمجھتے اور واقع ہونے والا ایک امر خیال کرتے ہیں، وہ یا تو کورمغز ملّا ہوتے ہیں یا شہوت پرست زاہد۔ یہ دونوں قسم کے لوگ حقیقتِ قرآن کو مطلق نہیں سمجھے اور نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہے ہیں۔

(۲) اصل حقیقت یہ ہے کہ جنت اور دوزخ اور اس کی نعمتیں یا عذاب سب کچھ تصوراتی باتیں ہیں۔ جو انسان میں ترغیب و ترہیب پیدا کرنے کا کام کرتی ہیں۔ اور جو لوگ اس حقیقت کو سمجھ گئے وہی تربیت یافتہ دماغ ہیں، کیونکہ یہ محض نظریاتی چیزیں ہیں عملی زندگی سے ان کا کچھ تعلق نہیں۔

(۳) کوئی جنت و دوزخ کو محض خیالی سمجھے یا حقیقت سمجھے۔ دونوں کا نتیجہ یکساں ہوتا ہے۔ یعنی انسان اوامر بجالاتا اور نواہی سے بچ جاتا ہے۔

غور فرمائیے سید صاحب خدا اور رسول ؐ کے متعلق کیا تصور پیش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ متواتر تیرہ سال جنت اور اس کی نعمتوں کے متعلق، دوزخ اور اس کی تکالیف سے متعلق آیات نازل کرتا رہا اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کی تبلیغ کر کے لوگوں کے اس تصور کو پختہ سے پختہ تر کرتے رہے۔ اس تصور کی پختگی سے مقصود یہ تھا کہ لوگ اچھے کام کریں اور برے کاموں سے بچیں۔ جب مقصد حاصل ہو گیا، تو اب مرنے کے بعد جنت اور دوزخ کو فی الواقعہ قائم کرنے کی ضرورت بھی کیا رہ گئی؟ اس سے واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ خدا اور رسول ؐ نے لوگوں سے دھوکا کر کے (معاذ اللہ) اور جنت و دوزخ کا تصور پختہ کر کے جب اصل مطلب حاصل کر لیا۔ تو اب اس وعدہ و وعید کو عملی شکل دینے کی ضرورت بھی ختم ہو گئی۔ یہ اللہ کا وہ وعدہ ہے جس کے متعلق اس نے فرمایا ہے کہ کَانَ وَعْدُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا۔

© rasailojaraid.com